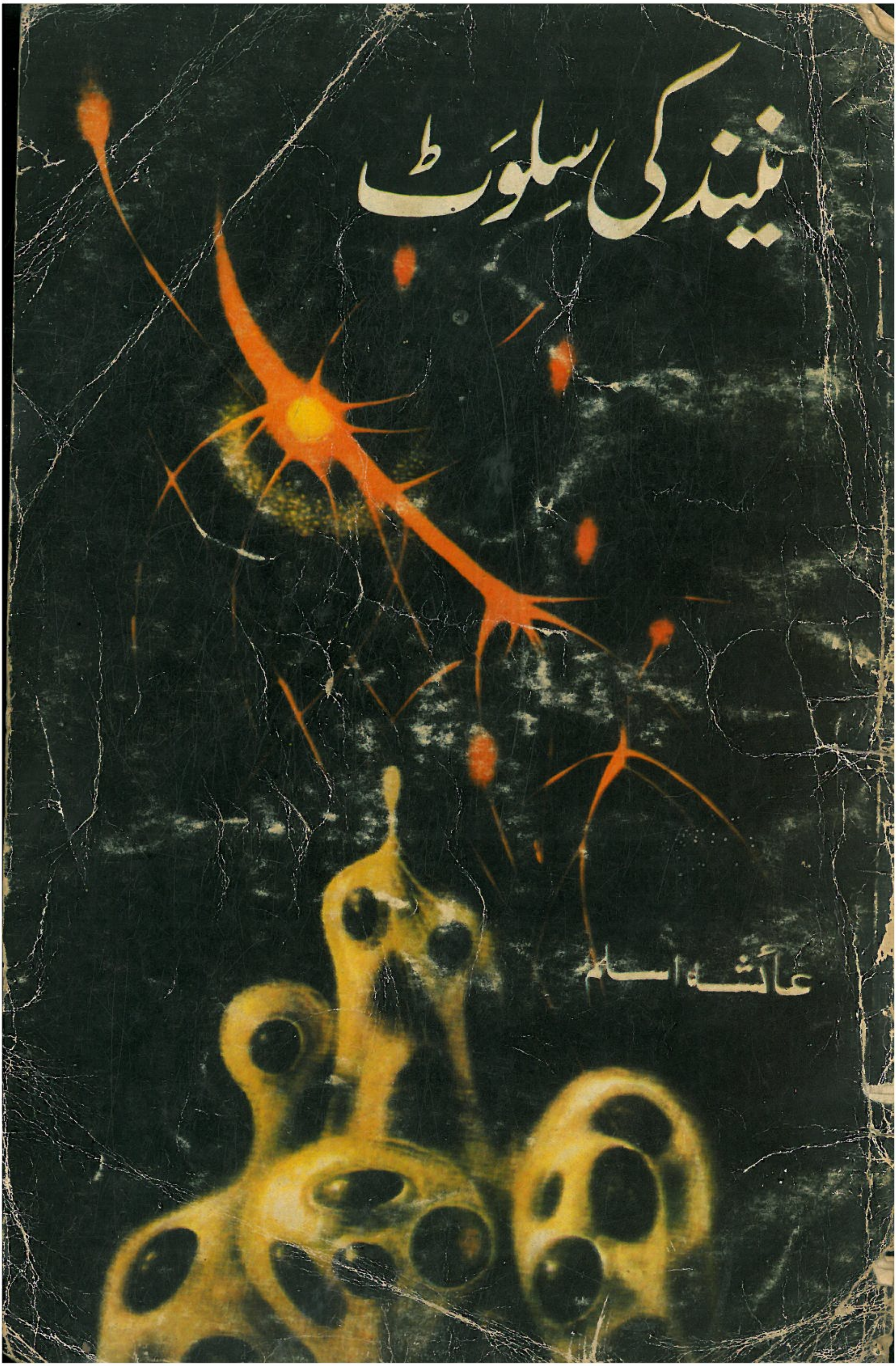

نیند کی سِلوٹ
عائشہ اسلم

نیند کی سلوٹ

عائشہ اسلم

نام کتاب ـــــــ نیند کی سلوٹ
مصنفہ ـــــــ عائشہ اسلم
ناشر ـــــــ انیس یعقوب
پرنٹرز ـــــــ وفاق پرنٹرز لاہور
بار اوّل ـــــــ اگست ۱۹۸۷ء
تعداد ـــــــ گیارہ سو
قیمت ـــــــ روپے

ملنے کا پتہ
A-۲۹ چوہان روڈ اسلام پورہ لاہور ۱

سرمد

روزم تو بر فروز و شبم را تو نور بخش
کیں کارِ تُست، کارِ مہ و آفتاب نیست

انتساب

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ غنودیم

حسن دہلوی

فہرست

اعتراف

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے لمحے لوگ چرا لے جاتے ہیں۔ یہی لوگ جو نہ جینے دیتے ہیں اور نہ ہی مرنے دیتے ہیں۔ لیکن نہیں اگر ایسا ہوتا تو آج تک اخباروں میں جتنی بھی خودکشی کی خبریں شائع ہوئیں ــــ وہ خبریں ــ خبریں نہ بنتیں۔ سارا شگفتہ ریل کی پٹڑی پہ خود کو تقسیم نہ کرتی۔ کراچی شہر میں دو لڑکیوں کی عزّت نہ لوٹی جاتی ــــ آج اتنی ترقی کے باوجود عورت غیر محفوظ ہی ہے۔ تو کیا ہمیں پھر اسی وقت میں واپس جانا ہوگا جب لڑکیاں زندہ دفن کی جاتی تھیں ؟ یا پھر اینٹوں میں چنے جانے کی رسم دوبارہ شروع ہوگی ــــ کب ہمیں انسان کا رتبہ ملے گا۔ ہماری عزّت، عزّت مانی جائے گی۔ لفظوں میں تو ہم عورت کو بہت احترام، محبّت اور عزّت دیتے ہیں ــــ جبکہ زندگی میں اسی عورت کو ہم کسی لائق نہیں سمجھتے ــ ہمارے نزدیک اس کا ایک ہی مصرف رہ جاتا ہے ــــ "عیاشی" عورت کو لوٹنے نوچنے اور کھا لینے کی خواہش اور کوشش تو سبھی کرتے ہیں ــــ لیکن اسے غنڈوں سے بچانے کے لیے کوئی آگے نہیں بڑھتا۔ ہاں ایسی کئی سچویشنز ہم نے فلموں میں ضرور دیکھی ہیں ــ وہاں ہیرو ہوتا ہے ــ کاش ہم اصلی ہیرو بھی پیدا کر سکتے۔ ہم اچھے انسان اور اچھے شہری بننے کی کوشش نہیں کرتے ــ ایمانداری اور اخلاص آج کل بہت بڑی خامی جانی جاتی ہے۔ ہم خوبیوں کے معترف ہیں ــ جو خوبیاں ہم خود میں پیدا نہیں کرتے وہی دوسروں میں تلاش کرتے ہیں۔

میں بھی اپنے باہر اپنے اندر جیسے انسان تلاش کرتی ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھ ایسی بھٹکی روحیں آج کہاں ملیں گی ؟

آج ہماری زندگی لوگ بسر کرتے ہیں ــ ہمارے نام کے سُکھ بھی وہی لے جاتے ہیں۔

منافقت اور جھوٹ کے ماحول میں ہم کیسی زندگی گزارنے پہ مجبور ہیں ــــ؟ مگر زندگی گزارنا ہی پڑتی ہے۔ میں نے جب زندگی کو برتا تو جانا کہ دُکھ جھیلنے اور سہنے کو ہماری ہی جان مجبور ہے۔ اذیت کا ہر خاموش لمحہ ــــ روح پہ ایک گہرا نشان چھوڑ جاتا ہے ــــ یہ نشان کسی کسی کو نظر آتے ہیں۔ ہم بہت کچھ دیکھتے ہوتے بھی کچھ نہیں دیکھتے۔ سب کچھ جانتے ہوتے بھی جیسے کچھ نہیں جانتے۔

نیند کتنی اچھی ہے۔ اس کا علم وہی رکھتے ہیں جنھوں نے تنہائی کی آگ کی تپش محسوس کی ہو ــــ جو اس آگ میں راکھ ہوتے ہوں۔ جنھوں نے رتجگوں کا تلخ و ترش زہر گھونٹ گھونٹ پیا ہو۔

آج جب میں نے گزرے لمحوں کے آبلے پھوڑے تو دیکھا ــــ میرا سارا بدن اور میری رُوح نے آبلے کی صورت اختیار کر لی ہے۔

آج جب میں اپنی آگ اور زہر تقسیم کرنے نکلی ہوں تو کچھ گھونٹ آپ کے حصّے میں بھی آتے ہیں۔ میں آپ کا نام مٹا نہیں سکتی ــــ میں اتنی ظالم نہیں کہ آپ کو آپ کے اس حق سے محروم کر دوں ــــ میں جانتی ہوں آپ کو آپ کے حقوق نہیں ملے ــــ آپ کی باری آنے پر صرف فرائض رہ جاتے ہیں۔ آپ میں سے ان کو حق مل گیا جو مرد کہلاتے ــــ عورت کا حق تو کہیں بھی نہیں ہوتا ــــ اُس کا حصّہ بھی اُسے نہیں دیا جاتا ــــ وہ جائداد میں بھی حصّہ دار ہے ــــ مگر کتنے فیصد عورتیں ہیں جنھیں اُن کا حصّہ دیا گیا ہو ــــ عورت کی تو گواہی بھی آدھی ہے۔ عورت کی تو خواہشیں بھی ادھوری رہتی ہیں ــــ وہ خواب بھی ادھورے دیکھتی ہے۔ وہ زندگی بھی ادھوری جیتی ہے ــــ دوسروں کے حکم مانتی رہتی ہے ــــ خود حکم چلاتے تو کیا ہوتا ہے ــــ سبھی جانتے ہیں۔

میں بھی عورت ہی ہوں۔ ہر الزام میرے ہی سر آتا ہے۔ میں ہی مجرم مانی جاتی ہوں۔ آج میں اس کتاب کے حوالے سے ہر الزام اور ہر جرم تسلیم کرتی ہوں ــــ لیکن میں منافق نہیں ــــ سچی اور کھری ہوں ــــ اسی لیے سزا ہوں۔

آج اس اعتراف کے ساتھ یہ "نیند کی سلوٹ" آپ کے سپرد کرتی ہوں کہ میری تھکن نے میرے پاؤں کے گرد ایک دائرہ کھینچ لیا ہے۔ میں اس سے باہر نہیں نکل سکتی۔ مجھے اپنے سچ

کی یہ سزا بھی جھیلنا ہو گی!

اک درد تھا
جسے میں نے چپ چاپ
سگریٹ کی طرح پیا ہے
صرف کچھ نظمیں ہیں
جنھیں میں نے سگریٹ کی طرح جھاڑ لیا ہے!

امرتا پریتم نے اپنے بارے میں یہی کہا ہے ناں ــــ؟
مجھے بھی اپنی نظمیں وقت کی سیڑھیوں پہ گر جانے والی سگریٹ کی راکھ کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔
وقت ــــ جو ایک سیڑھی ــــ ایک راستہ ہے ــ ایک سفر ہے ــ زندگی کا سفر ــ
ہم سب جو زندہ دکھاتی دیتے ہیں ــ زندہ نہیں ہیں ــ ہم تو مُردہ زندگی گزار رہے ہیں۔
سفر کوئی بھی ہو تھکن راستہ روک لیتی ہے ــــ میں ٹھہر گئی ہوں ــــ!

عائشہ اسلم
۲۲- غالب کالونی
سمن آباد- لاہور

انقلاب

جب میں پیدا ہوا
تب وہ آزادی کا جشن منا رہے تھے
میری ماں نے
قیدِ تنہائی میں
میری زندگی کی پہلی آواز سُن کر
خوشی سے موت کو صدا دی
اور میرا باپ تو بہت پہلے مر گیا تھا
اُسی دن کے بعد جب اُسے علم ہوا تھا
کہ اُس کے عمل سے ایک عورت حاملہ ہو چکی ہے
مگر شائد یہ بات بھی وہ نہ جانتا ہو
جیسے میری ماں نہیں جانتی
کہ میں اُن میں سے کس کی اولاد ہوں؟
مگر آج ماں کی چیخ نے مجھے رونا سِکھا دیا
کہ موت اُس کے پیروں تک آ پہنچی تھی
اُس نے کہا

سُنو! وہ آگیا

اب میری جگہ وہ یہ قید گزارے گا

ایک دن

سب قید خانوں کو صفحۂ ہستی سے مِٹا دے گا

میں نے اُس کی رگوں میں اپنا لہُو نہیں

اِن سلاخوں سے نفرت کا زہر بھر دیا ہے

میں نے اُس کے خشک ہونٹوں سے

اپنی سُوکھی چھاتیاں نہیں لگائیں

کہ میں اُسے خوبصورت اور جوان چیز دل سے

محبت کرنا سکھا رہی ہوں

میں نے اُس کی آنکھوں میں آنسُو نہیں ٹپکایا

اپنے میٹھے خوابوں کا بیج بویا ہے

میرے بچے!

جا میں نے تجھے یہ وہ رات کو سونپا

کہ تو اُس کے بدن میں نیا نُور بھر دے

اور وہی رات کل تیرے سُورج کو جنمے

الوداع میری جان —— الوداع!

ہم خود اپنے قاتل ہیں

وہ ہماری ہی کلہاڑیاں تھیں
ہم ناداں تھے
جنھوں نے اپنے پاؤں کاٹ دیئے
کیونکہ ہمارے ہاتھ بھی کاٹ دیے گئے تھے
جو ہاتھ دھرتی پہ لہُو سے گیت نہ لکھتے ہوں
وہ زندہ کیسے رہ سکتے ہیں
آج بھی ہم گہرے رنگ دیکھ کر جذباتی ہو جاتے ہیں
کبھی کبھی اشتعال انگیز تقریریں بھی کرتے ہیں
مگر ہمارے لفظوں نے نافرمانی سیکھ لی ہے
ہم اپنی ذات میں بے بس ہو گئے ہیں
مجھے پتہ ہے
ہمارے پاؤں نہیں رہے
مگر نشان باقی ہیں

ہم سفر نہیں کر سکتے
لیکن ہماری خواہشوں کے پاؤں نہیں رُکے
ہماری خواہشیں تھکن کی لذّت سے واقف نہیں
رتجگے ہماری آنکھوں کے لیے اکسیر ہیں
اور ہماری تاریخ بھی
گہری نیند سے اک دن ضرور جاگے گی!

چاہت پیما

میں اندھیرے میں
مہارت سے آگے اور آگے چلتی ہوں
مگر روشنی میں
چیزیں مجھ سے ٹکرا جاتی ہیں
میں نہ چاہتے ہوئے بھی
گر جاتی ہوں
مر جاتی ہوں
سنبھل جاتی ہوں
جی اُٹھتی ہوں
پُرانے سبق دہراتی ہوں
امتحان میں آنے والے سوالوں کے جواب حل کرتی ہوں
چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے
میں کامیاب ہی رہتی ہوں!

گیلی سڑک

بزدل ہمسفر

تھکن میرا راستہ نہیں روکتی
میرے پاؤں ہزاروں میل تک
کالی گیلی سڑک پر
میرے ساتھ سفر کرتے ہیں
کرتے ہی چلے جاتے ہیں
مگر میری جوتی کے اعصاب کمزور ہیں
وہ بہت جلد تھک جاتی ہے
ٹوٹ جاتی ہے
گر جاتی ہے!

دل کی موچ

گھنٹی کی آواز
سُوئی کی ٹِک ٹِک
ٹین کی چھت پہ گرنے والی بوند
چیخیں — چیخیں
شور — وحشت
تنہائی
خوابوں کی تخلیق کا موسم
چہرے اور ہجوم
خوابوں کے نوالے نِگلنے کو
دن کی دھُوپ سے وقت
روشنی سے اجازت مانگتے ہیں
سب کچھ موقع ملتے ہی چوری ہو جاتا ہے
اغوا کی خبر پُرانی ہے
ہر کہانی وہی کہانی ہے
جو ہم بھُول گئے

یا جس کی یاد ستاتی ہے
آواز چپ کی کوکھ سے جنمے گی
اُن کی آنکھیں حیرت سے اُبل پڑیں گی
اُن کے ہاتھ آپس میں اُلجھیں گے
اُن کے پاؤں کی اُنگلیاں مُڑ مُڑ جائیں گی
موچ پاؤں میں نہیں
اُن کے دِل میں آئے گی!

ان گنت

میں نے اپنا پہلا بوسہ خدا کو دیا

دوسرا بوسہ والدین کو

تیسرا بوسہ بہن بھائیوں کو

چوتھا بوسہ علم اور عمل کو

پانچواں بوسہ حرف کو

چھٹا بوسہ معصوم ہنسی کو

ساتواں بوسہ آنسوؤں کو

آٹھواں بوسہ سمندر کو

نواں بوسہ آسمان کو

دسواں بوسہ درخت کی برہنہ ٹہنیوں کو

گیارہواں بوسہ ہوا کو

بارہواں بوسہ زرد اور گہرے سبز پتوں کو

تیرھواں بوسہ اپنی تنہائی کو

چودھواں بوسہ اپنی وحشت کو

پندرہواں بوسہ اُداسی کو

سولھواں بوسہ اپنی عُمر کو

سترھواں بوسہ تجربوں کو

اٹھارھواں بوسہ تھکن کو

انیسواں بوسہ نصیحت کو

بیسواں بوسہ خوابوں کو

اکیسواں بوسہ تاریکی کو

بائیسواں بوسہ اُجالے کو

تیئیسواں بوسہ اعتماد کو

چوبیسواں بوسہ دوستی کو

پچیسواں بوسہ محبّت کو

چھبیسواں بوسہ بے قیمت لوگوں کو

ستائیسواں بوسہ موت کی حد سے گزرنے والوں کو

اٹھائیسواں بوسہ زندگی سے گزرنے والوں کو

انتیسواں بوسہ خود سے متعلق اجنبی لوگوں کو

تیسواں بوسہ اپنوں کو

اکتیسواں بوسہ اُن کو جن میں میرا پرتو ہے

بتیسواں بوسہ اپنی رکتی سانسوں کو

تینتیسواں بوسہ موت سے زندگی کی طرف آنے والی عورت کو

باقی کے چند بوسے میں نے اجنبی آوازوں میں بانٹ دیے

اور میرا بوسہ ——— ؟

جب خود کو بوسہ دینے کا وقت آیا
تو یہ روایت ختم ہو چکی تھی
اور ہمارے مذہب میں مُردہ پرستی حرام ہے !

اجنبی رشتے

ماں!
تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو؟
اگر یہ واقعی میرا گھر ہے
تو اسمیں اتنے بہت سے لوگ کہاں سے آتے؟

یہ کون ہیں؟
کیا اجنبی ہیں؟
یا اپنے ہیں
اگر اپنے ہیں تو اپنوں سی باتیں کیوں نہیں کرتے؟
اگر اجنبی ہیں
تو ایک مدّت سے مہمان کیوں ہیں؟
اکثر لگتا ہے جیسے میں بھی مہمان ہوں
ساری عمر اس گھر کے گیسٹ روم میں سوتی جاگتی رہی
ڈرائنگ روم میں بیٹھی پُر تکلّف چائے پیتی رہی

ہر موضوع پر گھنٹوں بحث کرتی رہی
جیسے بحث کرنا ہی میرا اہم کام ہو
یا جیسے میں مہمان بنے رہنے کے لیے پیدا کی گئی ہوں
آخر تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو؟
میں کون ہوں
اس گھر سے میرا کیا رشتہ ہے؟

ذائقے

جلی ہوئی مونگ پھلی
اور مُردہ چلغوزے
کڑوا بادام کھانا میری عادت ہے
بلکہ عادت بھی نہیں
یہ ایک عجیب مجبوری ہے
اب میرے ہاتھ مانوس ہو چکے ہیں
اور میری زبان انہی ذائقوں سے آشنا ہے
ہاتھ اور زبان کی طلب سچّی ہوتی ہے
میں خود کو جھٹلا نہیں سکتی
یہ میری مجبُوری ہے
میں زندگی کو بھی مجبُوری سمجھتی ہوں
اور نوالوں کی جگہ دن کھاتی ہوں!

جو منتظر ہو

منتظر سے کہو
وہ میری آواز تقسیم نہ کرے
تعلق کے ضمیمے چھاپنے والوں سے محبّت کیسی ؟
نفرت تو عظیم جذبہ ہے
ہر شخص اس کا اہل کہاں ؟
منتظر سے کہو
میں دل کی روشنی میں ضرور آؤں گی
چاہے اس وقت صبح ہو، شام ہو یا رات
مجھے قرض چکانا ہی ہے
منتظر سے کہو
مجھے دلاسہ نہیں
اُس کا ساتھ چاہیئے
منتظر سے کہنا
میں بھی منتظر ہوں !

دیوار سے اِدھر

ایڑھیاں اُٹھا کر دیوار سے پرے کی متحرک زندگی دیکھنا نیا تجربہ ہے
میں دیوار پر چراغ روشن نہیں کرتی
اپنے خواب چھت پہ کوؤں کے لیے پھینک دیتی ہوں
سُورج کا چہرہ دیکھتے ہی
چیلیں میرا بدن نوچنے آتی ہیں
عذاب اور اذیّت کی طویل کہانی ادھوری ہی رہتی ہے
تنہائی اور اُداسی
مُسلسل نظم کے مصرعے کہیں کھو جاتے ہیں
شدید جذبوں کی عکاس تصویریں
سب وقت کے ہاتھوں ضائع کر دی جاتی ہیں
باتوں کا، عمل کا سرا کہیں نہیں ملتا
ہاتھ منتظر ہی رہتے ہیں
اُلجھے دھاگوں کو سُلجھاتے سُلجھاتے
میری اُنگلیاں رگوں سے اُلجھتی ہیں

میں دیکھتی ہوں

میری شریانوں میں لہُو پتھر ہو گیا ہے
میں اپنی آنتوں سے رُوح کی گٹھڑی باندھتی ہوں
نئے سفر پہ روانہ ہونا چاہتی ہوں
میری اُنگلیاں ہی نہیں
تمام اعضاء میرے بدن سے جُدا ہو گئے ہیں
بس آنکھیں رہ گئی ہیں !

بے جہت اندازے

وہ میری عُمر سے تجربوں کا اندازہ لگاتے ہیں
اور میرا قد انچوں سے ناپتے ہیں
میں کہتی ہوں
میں تو بہت سوں سے اونچی ہوں
وہ کہتے ہیں
تم ہم سب سے چھوٹی ہو
ہاں تمھارے مضامین مختلف ضرور رہے ہیں
تم ہم سے زیادہ ہنرمند ہو
مگر تم ہم سے زیادہ مُردہ زندگی گزارتی ہو
ہم زندگی کو زندگی کا لُطف اور انعام جان کر
اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہیں
اور آنکھوں سے چُومتے ہیں
ہمارے دروازے مسّرت کے لیے کھُلے رہتے ہیں
تم نے کھڑکیوں دروازوں پر چٹخنی لگا دی ہے
تم نے دیواروں میں کیل ٹھونک کر سوراخ بند کر دیے

تصویریں لگا دیں ـــــ برہنہ عورتوں کی تصویریں
تم نے عُریاں مجسموں سے کمرہ بھر دیا
تم نے کتابوں کے بستر پہ مضطرب بدن کو سکون دینا چاہا
مگر سر پٹختی رہی
تم نے تجربوں کے جوتے زمین کے سر پہ مارے
مگر لاحاصل
اپنے پاؤں زخمی کر لیے
لہولہان رُوح ، بدن ، دیواریں ، چھت
کمرہ آہوں سے بھر گیا
تم نے تسلّی کی خاطر
لفظ ہوائیں بکھیر دیے
ہاں میں لفظوں میں سانس لیتی ہوں
اجنبی سانسیں میرے کمرے میں ہر جگہ ٹہلتی ہیں
میں اقرار کرتی ہوں
میرا دم گھٹتا ہے
میرا دم گھٹتا ہے
میرا دم گھٹتا ہے !

انتظار

میرا دل سینے میں نہیں
میرے ماتھے میں دھڑکتا ہے
میرے جذبے
ہاتھ میں پسینہ بن کے ضائع ہونے کی تیاری کرتے ہیں
حرف مجھ سے پناہ مانگتے ہیں
اور تخلیق موت کی بہترین مثال ہے
تجربے میری کثیر اولاد
اسی لیے ماں باپ کے دُکھ پہ اُداس ہوتی ہوں
میری رُوح کانپتی ہے
میری رُوح کانپتی ہے
تجربے ـــــ تجربے نافرمان اولاد
والدین کے غم اُن کے قلب کی طرح عظیم ہوتے ہیں!

اُن کی نظر اور ذہن وسیع نہ بھی ہو
تو جانتی ہوں
ان کی خواہشیں بے حساب ہوتی ہیں
وہ آنکھیں پھیلائے بچّوں سے خوشی مانگتے ہیں
بچّے پیدائش کے فوراً بعد بھاگ جاتے ہیں
راستے منتظر ہی رہتے ہیں!

تشنۂ تکمیل

میں راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر پانی نہیں پیتی

اپنے لہُو کی تلخ شراب پیتی ہوں

جس کا تیز نشہ مجھے درد کے مسلسل عذاب میں مبتلا رکھتا ہے

میں خود کو مصروف رکھتی ہوں

کبھی اپنے ناخنوں سے بدن نوچتی ہوں

کبھی آنتیں اُدھیڑتی ہوں

کبھی رگیں کاٹتی ہوں

کبھی اپنا کلیجہ چباتی ہوں

کبھی اپنی آنکھیں پھوڑتی ہوں

کبھی اپنے لب کا نوالہ بناتی ہوں

کبھی ہتھیلیوں پہ وقت کے خنجر سے لکیریں لگاتی ہوں

کبھی اپنے لہولہان بدن اور رُوح کو گھسیٹے پھرتی ہوں

شہر میں — دُنیا میں — دنیا سے باہر

میں نے آوارہ گردی کی تربیّت بھی خود سے حاصل کی

کیا اب میں مکمّل ہو گئی ہوں؟

اب میں مکمّل ہو گئی ہوں !!!

باغی مہک

میں ہمیشہ قطار سے نکل جاتی ہوں
اب بھی فٹ پاتھ چھوڑ کر سڑک پہ چلتی ہوں
سُرخ اشارے پہ چلتی ہی رہتی ہوں
کہیں ٹھہرتی نہیں
سب جگہ اجنبیت کی دُھند چھائی رہتی ہے
میں جُدائی اور ملاپ کی سرحد پہ کھڑی ہوں
شاید گھنٹوں، دنوں، مہینوں، سالوں صدیوں سے کھڑی ہوں
میرے پاؤں زمین کی باہوں نے مضبوطی سے تھام رکھے ہیں
میرے تلوے مہربان زمین کے بوسوں کی بارش میں بھیگ رہے ہیں
کیا تم جانتے ہو ؟
میری مہک لوگوں کو دیوانہ کر دیتی ہے
میرا بدن شعور کی آگ نے جُھلسا دیا ہے
وقت نفرت سے منہ پھیر لیتا ہے
رُوح کے درد زندگی سے پناہ مانگتے ہیں !

اے میرے مسیحا

آؤ! میری سانسوں میں اپنا زہر بھر دو
میری رُوح اپنے اندر منتقل کر لو
سگریٹ کے کش کی طرح
میرے بدن کا ایک گھونٹ بھر و
شراب کی طرح
میں زندگی اور موت کے دوراہے پہ کھڑی ہوں
مجھے زندگی اور موت سے بچا لو!

اننت تنہائی

وہ مجھے سگریٹ نہیں دیتے
میری ہتھیلی درد کی شدت سے کراہتی ہے
میرا ماتھا گرم ہے
میری روح سرد
میرا موسم تنہائی!

آؤ

آؤ دھوپ کو باندھیں
بادل کا ماتھا سہلائیں
آؤ! وقت کے پاؤں کے گرد اِک دائرہ کھینچیں
سفید چاک سے لکیریں لگائیں
انسان چیونٹی نہیں کہ ٹھہر جائے
انسان تو انسان بھی نہیں
مگر موت کے چابک سے بدن پر نیل پڑ جاتے ہیں
زمین سے پنجے مٹّی کھرچتے ہیں
صرف پاؤں ہی نہیں بلکہ پوری تاریخ ہم نے قبر میں دھنسا دی
اور پتّھر کا کتبہ
لفظ کے دھبے سے آزاد ہے
سب جانتے ہیں
یہاں تاریخ دفن ہے!

میں اور پھر میں

مجھے جلاوطنی کا حکم ملا
مگر میری روح کا مسلسل عذاب
اُس کی جان جھیلتی ہے
کوڑے اُسے پڑتے ہیں
درد مجھے ہوتی ہے
خواب کوئی اور دیکھتا ہے
آنکھ میری روتی ہے
خواہش مکڑی نہیں
مگر جالا بُنتی ہے
وہ مجھ میں مقیم ہے
میں اُس میں مقیم ہوں
مگر فاصلوں کی تھکن
گویائی کی قوّت چھین لیتی ہے
ہم ایک دوجے سے چھُپ کر روتے ہیں!

یکم اکتوبر کی نظم

UNDER WEIGHT

سُنا ہے
میری ماں نے بہت چاہا
میرے نام کے حمل کی میعاد سے پہلے پہلے
کچھ ایسا ہو جائے
کہ میرا نشان نہ رہے
مگر میں ضدّی بچّہ تھی
جلد ہی ماں کے پیٹ سے نکل بھاگی
یہ میرا پہلا فرار اور اصلی بغاوت تھی
ہم جڑواں بہنیں تھیں
دوسری بہن کو میں برداشت نہ کر سکی
کوئی بھی دوسری کبھی برداشت نہ کر سکی
سو میں نے اُسے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر مار ڈالا
روایت ہے کہ وہ خود ہی مر گئی
پھر میں انکیوبیٹر میں مصنوعی نظامِ تنفّس کے تحت زندہ رکھی گئی
میں Under Weight تھی
اسی لیے میری سانس گھٹتی تھی (کیا میں اب تک Under Weight ہوں؟)

تب میری خاموشی شور نہیں مچاتی تھی
اور بند آنکھیں آنسوؤں سے بھری رہتی تھیں
وہ مجھے ہر روز دیکھنے آتے تھے
روز کی ایک جھلک اُن کی خوراک تھی
ڈاکٹر موریس کا کہنا تھا
کسی بھی روز یہ خوراک ہمیشہ کے لیے چھینی جا سکتی ہے
کہ وہ چھیننا بھی جانتا ہے
ماں کہتی ہے
میں بہت خوبصورت تھی
پہلی اکتوبر سے کرسمس تک کا انتظار ان کے لیے بہت تھا
پھر دو چہروں نے مسکرا کر یہ تحفہ قبول کیا
مُردہ چہروں سے مُردہ زندگی کی طرف ہجرت کرنا پڑی
نتیجہ کیا ہوا؟
میں بہت سی بیماریوں کے نرغے میں آ گئی
(ابھی تک اسی ہجوم میں ہوں)
ماں نے بہت چاہا
کہ میں اُس کا دودھ پیوں

باغی ٹھہری

جانتی تھی جوان ہونے پر بھی وہ دودھ نہ بخشے گی
میرے موہنہ کو کسی دودھ کا ذائقہ شناسا نہ لگا
ماں کے دودھ سے بھی پرہیز کئے رکھا
ممکن ہے یہی وجہ ہو کہ میری رگوں میں اُس کا دودھ نہیں
میرے خوابوں کا لہُو محوِ گردش ہے
میں جو پہلے نابالغ تھی
وقت کے ہاتھوں بہت پہلے بالغ کردی گئی
میرا جسم خالی رہا
اور ذہن سوچوں سے بھر گیا
میری روح تنہائی کے مُسلسل عذاب کو سہہ رہی ہے
میرے بدن کی عمارت زیرِ تعمیر ہوتے ہوتے بھی
ڈھے جانے کو ہے
میں ہر بات جلد اور شدید محسوس کرتی ہوں
اس لیے علم رکھتی ہوں
کہ میں اب زیادہ دیر تک سانس نہیں لے سکتی
میں تمام عُمر انکیوبیٹر میں رہتے رہتے تھک گئی ہوں!

دستک

سگریٹ

دُھواں

مہک

سفر

زندگی، موت

اذیّت دھڑکنوں میں دھڑکتی ہے

عورت مچلتی ہے

مگر اپنے اندر

اُس کے باہر خاموشی

سکون کی بارش میں بھیگا بدن

بدن کے اندر آگ

بدن کے باہر

گہری ٹھنڈی سانسیں

سانسیں — سانسیں — سانسیں

دستک؟

سب چھل پیرے ہیں

آج زمانہ اُلٹے پاؤں پہ چلتا ہے
میں چھل پیری نہیں
پھر بھی وہ سب ڈرتے ہیں
ٹھہرتے نہیں
چل پڑتے ہیں
چل پڑتے ہیں!

کسے لکھوں؟

سردیوں کی دوپہروں میں
اُس گھر کے تمام کمرے
دھوپ کی لذّت سے آشنا ہوتے ہیں
سردیوں کی اُداس شاموں
مضطرب راتوں میں
ہیٹر کی گرمی انہیں سُکھ دیتی ہے
میرا کمرہ اور میں
دھوپ روشنی اور گرمی سے
محروم ہی رہتے ہیں
پہلا شکایت نامہ کسے لکھوں؟
انہیں یا خدا کو ـــــ؟

انگاروں پر رقص

میں نے وحشت پہنی
اور انگاروں پہ رقص کیا
لہو کے چراغ جلائے
رتجگوں کا ماتم کیا
مٹّی میں بیج کس اندھے نے بویا
وقت اور تاریخ
گونگے بہرے ہو کر سوچتے ہیں
مگر سوچ راستے میں گر جانے والی چوّنی ہے
کوئی اور اُٹھا کر چل پڑتا ہے
کوئی تلاش کرتا ہے
نہ ملنے پر
ماں سے تھپّڑ کھاتا ہے
اور باپ کی جھڑکی
گالی بن کر کان سے دل میں اُترتی ہے
مُسکرانے کی عادت چھُوٹنے پر
وہ روتے ہیں!

ریشمی سُوت

میں تاریخ کے آنچل کی اِک دھجّی
وقت کے ہاتھ میں کیسے رہتی ؟
عشق کی سُوئی میں موت کا دھاگہ
کن ہاتھوں نے ڈالا ؟
میں کیا جانوں ؟
میں دِن رات، مہینے سال
صدیوں تک
مٹّی میں کھیلی
پھر تھکن نے دستک دی
ریشم کی باہنوں میں
سُوت کا دھاگہ بکھر گیا
جانے کدھر گیا ؟

ملازمت

ٹوٹی سیڑھیوں پہ چڑھنا
میری عادت نہیں
ضرورت ہے
جس طرح فائلوں سے بھری میز کو
سامنے رکھ کے بیٹھنا میری مجبوری ہے
فاقہ ہو تو شاعری نہیں سوجھتی
نظم نہیں بنتی
کہانی ادھوری رہتی ہے
آؤ! پہلے پیٹ کی آگ بجھائیں
پھر بدن اور نظر کی بات کریں
اُن کی پلیٹ خالی رہتی ہے
وہ آنسوؤں کے بغیر روتے ہیں
اور آواز کے بغیر ہنستے ہیں
وہ سب میرے افسر ہیں!

ہیں ایک مسلسل روگ
جسے کوئی چھاتی جھیلنے کا حوصلہ نہیں رکھتی
جس کے بوجھ سے زمین لرزتی ہے
زمین اپنے بوجھ سے نہیں
اپنی کم ہمتی سے لرزتی ہے
تنہائی سردی سے کانپتی ہے
مگر احمق لوگ کب جانتے ہیں
اکثر انسان اپنی طبعی موت نہیں مرتے
کچھ کو وقت کی آنکھیں زندہ نہیں دیکھ سکتیں
وقت نے حسد کرنا انسان سے سیکھا
انسان نے حسد کرنا خدا سے سیکھا
خدا نے آدمؑ کی غلطی کو معاف نہیں کیا
مٹّی سانس لیتی ہے
اُس کا بدن کانپتا ہے

سمندر سانس لیتا ہے
اُس کا دِل دھڑکتا ہے
پپیہوں کی آواز سُن کر
انسان، حیوان، چرند، پرند، زمین آسمان
سبھی پناہ مانگتے ہیں
ہم سب پناہ مانگتے ہیں!

گیبریل اوکارا

گریز

ہم ہاتھ باندھے صدیوں سے کھڑے ہیں
اب ہاتھ پتھر ہو گئے ہیں
اور بدن سرد
ہم خود سے کوسوں دور بھاگتے ہیں
گیلی سڑکیں ہمارے پاؤں کے نشان اوڑھے
رتجگے کاٹتی ہیں

انہیں نیند نہیں آتی
انھوں نے موت کی روٹی توڑنے سے انکار کیا
اب ہماری زمین پہ اناج نہیں اُگتا
کنویں خشک ہو گئے ہیں
ہم بھوک پیاس میں بلکتے بچّوں کی
آسمان سے تصویر اُتاری گئی
قحط میں زمین چٹختی ہے
سفید ہونٹوں سے لہو رستا ہے
زندگی پر موت کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے!

ریزہ ریزہ

میرے دل میں ایک بہت بڑا مکان ہے
اُس کے کئی کمرے ہیں
ایک کمرہ یادداشت کے لیے
ایک 〃 کمزور حافظے کے لیے
ایک کمرہ مُسکرانے کے لیے
〃 〃 آنسو بہانے کے لیے
ایک کمرہ پہلی ملاقات کے لیے
〃 〃 آخری 〃 〃
ایک کمرہ جاگنے کے لیے
〃 〃 نیند کے لیے
〃 〃 خوشی 〃 〃
〃 〃 غم 〃 〃
〃 〃 شناسا چہروں کے لیے
〃 〃 اجنبی لوگوں 〃
〃 〃 زندگی کے لیے

ایک کمرہ موت کے لیے

〃 〃 زندگی موت کے لیے

〃 〃 آگ کے لیے

〃 〃 راکھ کے لیے

ایک کمرہ اُس آگ کے دریا کے لیے

جس سے ہر پل گزرنا ہی وقت کی ضرورت ہے

میرا وجود

اتنے کمروں میں بکھرا پڑا ہے

میں صدیوں سے تلاش کر رہی ہوں

اپنے لیے

کوئی خالی کمرہ!

انکار

مجھے میرے خوابوں کی سرزمین سے جلاوطن کرنے والے انسان

آج اپنے ہتھیاروں سے مارے گئے

خواہشوں کو برہنہ کرکے

شہر کی گلیوں میں گھسیٹا گیا

اور محبت سب سے بڑے چوک پر نیلامی کی منتظر ہے

روایات تبدیل کر دی گئیں

تاریخ کا چہرہ مسخ کیا گیا

وقت کی آگ نے بدن ہی نہیں

روحیں جلا ڈالی ہیں

تقدیر کا کاغذ ٹکڑوں میں بکھر گیا ہے

ہر طرف بُو پھیل گئی ہے

انسان اپنی آغوش میں پناہ مانگتا ہے

اور رب پناہ دینے سے انکاری ہے!

خاموشی

میں انسانوں کی طرح
کاغذ اور قلم کو بھی جُدائی کی گولی مارتی ہوں
وہ سب مر جاتے ہیں
اُن کی موت پر نہ کلائی سُونی ہوتی ہے
نہ مانگ سے سیندور مٹایا جاتا ہے
نہ سیاہ رنگ کا لباس پہنا جاتا ہے
نہ آنسوؤں کے گیت گائے جاتے ہیں
نہ آنکھیں بین کرتی ہیں
نہ چہرے پُرسہ دینے آتے ہیں
بس خاموشی اکیلی بیٹھی رہتی ہے
دیر دیر تک خلاؤں میں تکتی رہتی ہے!

نیلام

تم جن لفظوں میں مجھے بد دُعا دیتے تھے
وہ لفظ متروک ہو چکے
تم جن آوازوں میں مجھے پکارتے تھے
اب وہ لہجے کھو گئے
جو قدم میری سمت آتے تھے
وہ وقت کی دلدل میں دھنس گئے
تم — تم سب میری چاہت میں جلاوطن ہوئے
میرے آنسو تمھاری جدائی کی اُداسی میں بھیگے ہیں
جانے کتنے آنچل ؟
سارے شہر میں
برہنہ عورتوں کی فروخت کا سلسلہ جاری ہے
تم آخری گیت لکھنے سے پہلے
اس شہر کے صدر دروازے میں داخل ہونا
شائد تمھاری قسمت
کسی عورت کا مقدّر بدل دے
وہ بکنے سے پہلے بیاہی جاتے
شاید ......!

مُردہ زِندگی

میری اُنگلیاں جُھلس گیئں
ناخن سیاہ ہو گئے
اور خواب اندھے ہو گئے
راکھ میں سوتی عورت کی سِسکیاں
رات بھر گونجتی ہیں
منظر میں سگریٹ کا دُھواں
سگریٹ کی بُو کے ساتھ
اجنبی مرد کی آمد
دروازہ بند کر دیا جاتا ہے
چٹخنی کی آواز
اُس کے بعد مُسلسل خاموشی!

موت کی قیمت

میرے تلووں میں جما لہُو
تم سے کچھ کہتا ہے
میری موت کا اعلان ہوا کرتی ہے
مگر تم سُننے سے محروم رہتے ہو
آؤ! میرے خواب فروخت کر کے
اپنے لیے کوئی گھر لے لو
پھر اُس گھر کے لیے
خود کو فروخت کر کے
کوئی عورت
میں جانتی ہوں
تم عورت فروخت کر کے
بچّے لو گے
بچّے ذبح کر کے تم موت خریدو گے
موت ؟

دورِ جنوں

میں دیوانی عورت
ہر گھڑی وحشت میں
اپنے بال نوچتی ہوں
میری مُٹھی بالوں کے گچھوں سے بھری پڑی ہے
میرے ناخنوں میں میرے بدن کا ماس ہے
لہو زخموں سے پھُوٹتا ہے
اب پاؤں کے تلوے
منجمد لہو کے اسیر ہیں
زمین کی گردش رُک جاتی ہے
کیا سفر موت ہے؟
یا قیام زندگی ہے
موت، زندگی
لایعنی گفتگو
میرے کمرے کی دیواروں میں

میری چھت کے نیچے
بحث کرنا منع ہے
زہریلی ہوا چیختی ہے
زہریلی ہوا کی پکار سنو
خاموشی کلام کرتی ہے
خاموشی کلام کرتی ہے!

وحشت کا سفر

دروازے اور دیواریں
میرے ہاتھوں کے لمس سے آشنا ہیں
میں انسانوں کی درندگی سے آشنا ہوں
وحشت پاؤں یا ہاتھ کا ناخن نہیں
کہ کاٹ سکوں

وحشت تو لباس بھی نہیں
کہ اتار پھینکوں
وحشت تو زنجیر بھی نہیں
جسے توڑا جا سکے
وحشت میری آغوش میں سسکنے والی وہ بچی
جو برسوں میری پناہ کی تلاش میں بھٹکتی رہی
اور جب آغوش ملی

تو سکنے والی بچی نے
اپنے بچپن کا آخری سانس لیا
اور جوانی زینے سے اوپر چڑھی
چڑھتی چلی گئی
پھر پھسل گئی یا ٹھہر گئی
ہم نہیں جانتے!

میں جانتی ہوں

میں جانتی ہوں
اس عمر میں جھولا جھولنے کا انجام کیا ہوتا ہے ؟
مجھے سر کے بل
یا اوندھے منہ گرنا ہوگا
میں پرندوں کا سفر دیکھنا چاہتی ہوں
مگر وہ کسی بات پر آمادہ نہیں ہوتے
میں خواہشوں کو جلاوطنی کی دھوپ سے بچا بھی لوں

تو جانتی ہوں
کبھی کبھی بارشوں کی صورت
زمین پہ طوفان آجاتا ہے

کبھی مٹّی سازش میں شریک ہو جاتی ہے
کبھی اچانک آگ بھڑک اٹھتی ہے

زمین کے عذاب
عمروں سے زیادہ طویل ہیں
اور اذیّت فنا ہونے کے تجربے سے نہیں گزرتی
ہر گھڑی محشر کی گھڑی میں تبدیل ہو جاتی ہے
ٹک — ٹک — ٹک !

چور اُدھار

ریت نے میرے ناخن چُرائے
اور زندگی نے میرے خواب

کیا دونوں چور تھے
نہیں سبھی چور تھے
کیا ہم بھی ۔۔۔؟
ہاں ہم بھی چور تھے
چور ہیں
چور ہوں گے

ہمیں ورثے میں چُوری کے ساتھ چوری بھی ملتی ہے
اور چوری کے ساتھ موت بھی
کچھ ادھار چُکائے نہیں جاتے
جیسے دوستی، جیسے محبّت
اور جیسے میں!

گُناہ

ہتھیلی پہ رکھے نوٹ گنے
اور زخموں کی گنتی بھول گئی
عورت! تم تو سیدھی گنتی بھی بھول جاتی ہو
اُلٹی کیسے گنو گی؟
اعترافِ گناہ کا وقت ہو گیا ہے
عورت تم نے کیسا گناہ کیا؟
شائد کوئی خواب تھا
جس میں لذّت بھرے گناہ تھے
یا سچ تھا
جب میں گناہ کمانے کو گناہ کر بیٹھی
کسی بے گناہ عورت کو وہ پتھر مارتے ہیں
کسی کو عزّت و وقار سے پُکارتے ہیں

جبکہ اُس کے سر پہ گناہوں کی کترنوں سے بھری گٹھڑی ہے
گناہ وہ کرے جِسے زندہ رہنا ہے
مجھے تو مرجانا ہے
میں تو مرچکی ہوں
پھر میرے گناہ کا حساب کون کرے گا؟
مٹّی جو خود بکھری ہوئی ہے
سمیٹنے کو ہاتھ ڈھونڈتی ہے!

مصروف خدا اور بُزدل میں

خدا مصروف ہے
اتنے غیر اہم کام کے لیے زمین پر نہیں آئے گا
تو کیا تیرے گناہوں کا شمار نہیں
شمار ہے —
کہاں ؟
میرے بالوں میں
میری آنکھوں میں
لہُو کے ذرّات میں
اور میری کتاب میں
جسے پڑھنے کی ہمّت کوئی نہیں رکھتا
سب ڈرتے ہیں
کس سے ؟
ربّ سے ، موت سے ، زندگی سے ، کتاب سے
تم بھی ڈرتی ہو ؟
ہاں !

جشن

کن ہاتھوں نے
دیے اُلٹ دیئے
اندھیری کھوہ میں رہنے والوں سے
تم اُجالے کی بات نہ کرنا
وہ تمھیں جاہل کہیں گے
چراغ کی لو مدھم ہوتے ہوتے
اکثر خاموش ہو جاتی ہے
آواز کی طرح
کبھی ہوا سے ڈر کے چراغ
خود ہی آنکھیں بند کر لیتا ہے
تمہاری آنکھیں کہاں ہیں ؟
میری آنکھیں پنجوں نے نوچ کے
ہوائیں اُچھال دیں
وہ ریزہ ریزہ مٹّی میں بکھر گئیں
انسان فتح کا جشن مناتا ہے !

سچا رشتہ

اولاد اور ماں کے رشتے کی ڈوری

کون آنول نال ؟

ہاں

لیکن وہ تو پہلے دن ہی ......

پہلے دن ہی اُس کا کٹ جانا بہتر ہے

بیچ میں کاٹو

تو ہر سال کوئی اجنبی ہاتھ

اس رشتے میں اک موتی پرو دیتا ہے

اور جب موتی نہ ہو

تب گرہ ....

اک اک کر کے کتنی گرہیں ؟

جتنے زخم اذیّت کے
کچھے بدن پر درد کی لہریں
ماں کو کیا سمجھاتی ہو؟
میں اپنی ماں کا ربّ ہوں
میں تو ربّ کی بیٹی ہوں
کونسی بیٹی
بے پالک؟

سوئی دھاگہ

یہ وقت تو ابھی چھوٹا ہے
میرے اک بوسے کے پیار جتنا بھی نہیں
میں اسے کہاں کچھ سمجھتی ہوں ؟
میں نے تو ہر ہونی کو انہونی
ہر انہونی کو ہونی بنانے کی قسم کھائی ہے
دانتوں سے انگلی کاٹ کر کھائی جانے والی قسم
پوری تو ہو جاتی ہے
لیکن درد کے دہانوں سے
میری پوریں
ہر گھڑی لہو تھوکتی ہیں
اور موت بدن ماپتی ہے ------

کوئی کفن میرے بدن کو راس نہیں
ہاتھوں نے کفن بنانے ترک کیے
سُوئی نے دھاگے کے لمس سے انکار کیا
سُوئی کی اذیّت نے
تھکن سے عمر بھر کا سودا کیا
ہاتھ گرفت کی لذّت تلاش کرتے ہیں
مجھے آشنائیوں سے ڈر لگتا ہے!

اختلاف

میں پانی پر نہیں چل سکتی
وہ خلا میں سفر کرتا ہے
میں موت سے نہیں نکل سکتی
اور وہ زندگی کا بدن اوڑھتا ہے
ہم اختلاف کے راستے پر چلتے ہیں
وہ اتفاق کو سنگِ میل سمجھتے ہیں
کیا ہم کبھی نہیں ملیں گے؟
ہاں ـــــ ہر سفر کے لیے ہمسفر ضروری نہیں
تنہائی تلوے چاٹتی ہے
میں کیچڑ میں حسن تلاش کرتی ہوں
کامیابی لہو کے پہلے قطرے میں نہیں
موت کی آخری دستک میں ملتی ـ ہے!

اسقاط

وہ فیصلہ تمہارا نہیں تھا
وہ جبر کے بطن سے نکلنے والا آدھا بچہ تھا
ادھوری زندگی — ادھوری موت
پیدائش سے پہلے — پیدائش کے بعد
فوری موت
ایسے کئی فیصلے ہم نے کئے
پھر کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیئے
تم بھی کاغذ میں لپیٹ کر پھینک دو!

دستِ دُعا

اب زمانہ نہیں رہا
مگر یقین جانو
اُس نے میرے بالوں کی لٹ تراش کر
اپنی ہتھیلی پر رکھی
پھر حافظے کے سپرد کر دی
اُس کی پُکار کو حاسدوں نے راہ میں روک لیا
آواز کی کوئی لہر مجھ تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوسکی
تم خواب کے جنگل میں تنہا تھے
میں زندگی کی آگ میں تنہا
ہم نے اپنی تنہائیوں کو آزاد کیا
شام کے وقت الوداعی بوسہ نہیں لیتے
محبّت کو وقت کی نظر کھا جاتی ہے
تم روٹی کا نوالہ کھا کر بھُول جاتے ہو
میں موت کا ذائقہ بھولنے کی کوشش کرتی ہوں
مگر کچھ ذائقے زندہ رہتے ہیں
آؤ! اُن کی مرگ کے لیے ہاتھ اٹھائیں
تاکہ آسمان سے کوئی پیغام آئے!

بچپن اور چھن بابلے

جب بھی بارش ہوتی ہے
میرا بچپن جی اُٹھتا ہے
میری جوانی مر جاتی ہے
جی چاہتا ہے
بارش میں خوب نہاؤں
کھیلتی جاؤں — کھیلتی جاؤں
لیکن میرے بدن میں گڑنے والی
لاکھوں آنکھیں

میرا بچپن کھو دیتی ہیں
میری آنکھیں رو دیتی ہیں!

عنقا

ہر موسم میں خواب نہیں دیکھتے
ہر تاریخ پہ سُرخ دائرہ نہیں کھینچتے
کچھ دن خالی بھی رہنے دو
اہمیّت لفظوں میں نہیں ہوتی
ہم منصفانہ تقسیم نہیں کرتے
چاہے وقت کی ہو
انسانی رشتوں، جذبوں
خوابوں یا دولت کی ہو
اب ہمیں تسلیم کر ہی لینا چاہیئے
کہ منصفانہ تقسیم کہیں نہیں ہوتی!

فلسفہ

خواب زندگی کی آنکھ سے ڈھلکنے والا آنسو
وقت کے چہرے پہ آڑھی ترچھی لکیریں
ہر چہرہ خوبصورت نہیں ہوتا
ہر موت بھیانک نہیں ہوتی
ہر وقت ٹھہرنا نہیں جانتا

انمول

ستارہ میرے خواب نہیں لے سکتا
خوشی کے لمحے
میری آنکھ میں ٹھہر گئے ہیں
اور درد کہیں بہت قریب سے آکر گزر گیا
خوشی درد سے زیادہ قیمتی ہے!

"میں"

اُس نے کہا لکھ حرفِ اوّل
میں نے لکھا وہ لفظ
جس میں کائنات سما جاتی ہے!

حوصلوں کے سلسلے

جو نظم کسی کاغذ پر نہ اُترے
کیا اُسے تم نے کبھی دل میں اُتارا
کبھی روح میں جگہ دی
آج میں نے
خود کو اور تم کو
ایک ایسی ہی اَن کہی نظم سُنائی!

جبرِ مستقل

میں نے اپنی آنکھیں مسمار کیں
تمھارے لیے گھر بنائے
میں نے زبان کاٹ ڈالی
خاموشی کو صدا کی اجازت کس نے دی ؟
کانوں نے سُننے سے انکار کیا
خواب سیڑھی پہ پہلا قدم
میں نے دھڑکن روکی
تم نے زندگی چُرالی
جبر — موت کی پہلی دستک
دروازے بند نہ کرو
ہَوا راستہ ڈھونڈ لے گی
زنگ آلود اشیاء پھینک دیتے ہو
انسان کہاں پھینکو گے ؟

ان پڑھ لوگ

میں نے برسوں پرانے کیلنڈر سنبھالے
مگر دن چرا لیے گئے
وقت کی اُداس آنکھوں نے دیکھا
ہر تاریخ نے زخم اُدھار لیے
اور آگ کی لپٹوں نے کئی بدن جلا ڈالے
کیلنڈر کی راکھ میں سسکتے لمحے
زندگی — زندگی پکارتے ہیں
میرے ہاتھ کی قبر میں ہر ماہ
ایک بچّے کا جسم چھپ جاتا ہے
میری کوکھ میں ہر نئے دن
گمنام اولاد کے لہو کا ایک قطرہ داخل کر دیا جاتا ہے
زہر میری رگوں سے موت کا سودا کرتا ہے
اُسی لمحے میں زندہ قرار دی جاتی ہوں
کسی کاغذ کو لوگ پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں
جس میں میری موت کی اطلاع ہے
مگر انھوں نے ابھی تک پڑھنا نہیں سیکھا!

سارا شگفتہ کے لیے ایک نظم

کفن چور

سارا !

ابھی تمہارے بچے کے کفن کے پیسے بھی پورے نہیں ہوئے

اور تم نے دُنیا کے صندوق سے اپنا کفن کُترلیا

تم پہ چوری کا الزام لگانے والے سب نابینا

سارا !

میں نے تو ساری دنیا کے کفن چُرانا ہیں

ابھی تو تیرا میر احساب بھی باقی ہے

ہمیں ابھی نہیں مرنا

کفن کے پیسے پورے کرنا ہیں

یا کفن چُرانا ہیں

تم جانتی ہو ناں

ہم کفن چور ہی پیدا ہوئے

اور کفن چور ہی مر جائیں گے !

اس عہد کی عورت

شہر کے سب سے بڑے چوک پر
میری لاش پڑی ہے
لوگ نظر جُھکا کے دیکھتے ہیں
گزر جاتے ہیں
میرے بدن پہ لوگ پاؤں نہیں دھرتے
دستخط کرتے ہیں
یہ دستخط نہیں ان کی موجودگی کے اعلانات ہیں
جو خاموشی نشر کرتی ہے
سب سُنتے ہیں
اُن کی آنکھیں
ایک عہد کی کہانی پڑھتی ہیں
وقت کی آندھی
میری قبر کی تعمیر روک دیتی ہے
فاتحہ کے لیے اُٹھنے والے ہاتھ
اُٹھے ہی رہتے ہیں

مٹّی کے ڈھیر اُٹھانے کو کوئی انسان زندہ نہیں بچا
ہوا اپنا اخلاقی فرض پورا کرتی ہے
میری لاش
صدیوں سے چور لہے پڑی ہے
اب میرے لیے
ساری دنیا کی زمین بھی تنگ ہے
آسمان کو نیچے اُترنا پڑے گا!

اُدھار زندگی

دیس
تیرے خواب دیکھنے والی آنکھیں
وقت نے پھوڑ ڈالیں
اب وہ خواب نہیں دیکھتیں
صرف الزام سہتی ہیں
یا لہو بہاتی ہیں
جن ہاتھوں سے لوگ دیس پیار کے گیت لکھتے تھے
وہ ہاتھ وقت نے قلم کیے
جن لوگوں نے موت خریدی
ان سے زندگی کا سودا نہ ہو سکا
انسان بھیک کی پیداوار ہے
اسے بھکاری ہی رہنے دو
زبانوں کو ابھی جلاوطنی کا ذائقہ چکھنا ہے
زمین کا قرض بھی ادا کرنا ہے
اُدھار کی سانسیں

اُدھار کے خواب

ہم نے کوئی دوسرا سبق نہیں سیکھا
ہم ان پڑھ ہی رہیں گے
پچھلی تمام نسلیں
آنے والی تمام نسلیں
جہالت چاٹتی ہیں
منظر تبدیل ہو جاتا ہے
مگر تاریخ کا ماتھا
بوسے کی نعمت سے محرُوم ہو جاتا ہے
ورق سادہ ہی رہتے ہیں !

"چادر"

انگارہ

بدن میں نہیں
رُوح میں چُھپا ہے
میں سُلگنا کیسے چھوڑ دُوں ؟
دھیمی آنچ بھی دُکھ دیتی ہے
جدائی بھی روگ دیتی ہے
درد کا ذائقہ
میری زبان کی نوک پہ دھرا ہے
میری زبان آبلوں سے آشنا ہے
رُوح کے آبلے کون پھوڑتا ہے ؟
آؤ — ہم ان کے ہاتھ جلا ڈالیں
آنکھیں پھوٹیں
تو آنسُو نہیں بہتے
میں سرد اور تاریک ہوں
گمراہی میں کئی ہاتھ کانپتے ہیں
علم کی چادر جانے کہاں چُھپی ہے ؟

خواب مجھے لوٹا دو

کبھی مجھے چھونے کا گناہ نہ کرنا
لوگ تمہیں بے گناہی کے چشمے سے دیکھتے ہیں
کاش تم اندھے ہوتے
اور بیگانوں سی باتیں کرتے
تم فاصلوں کی دھول میں اَٹے ہو
مجھ سے قرب کی خواہش نہ کرنا
جُدائی کے اندھے کنویں میں میری آنکھیں گر گئی ہیں
تم مٹی میں محبّت تلاش کرتے نکلے ہو
اپنا بدن گروی رکھ دو گے؟
میں خود کو کنگن سمجھ کے تمہارے پاس رہن رکھ آئی تھی
آج سود سمیت خود میں لوٹ آئی ہوں
میرے خواب مجھے لوٹا دو!

بہانہ

شب خوابی کا لباس پہن کر
وعدے نہیں دہراتے
اور دعاؤں کی کتاب میں رکھی ہوتی
محبوب کی تصویر کے بہانے
وہ دعائیں یاد کرنے لگتی ہے
ماں کی آنکھوں پہ پٹی کس نے باندھی
بہن حاسد نہ بھی ہو تو ہو جاتی ہے
باپ کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی ہیں
فوراً چادر میں اپنا بدن چھپا لو!

ایک فرمائشی دُعا کے جواب میں

میری بند مٹھی میں جگنو نہیں

اُداسی ہے

اُداسی کی اپنی روشنی ہے

آنسوؤں کا اپنا ذائقہ

موت کی اپنی زبان ہے

خواب کا اپنا رنگ ہے

جھوٹ کی اپنی تاثیر ہے

دُعا کی اپنی آنکھ ہے

میں منافقت کے لیے اپنی آنکھ نم نہیں کر سکتی

مگر دعا مانگنا میری عادت ہے

میں کذب سے اَٹی زبانوں

اور منافقت بھرے پیالوں سے نفرت کرتی ہوں

شدید نفرت

دودھ میں زہر کس نے ملایا؟

ان ہاتھوں کو کاٹ ڈالو

ان ہاتھوں کو کاٹ ڈالو!

وصیّت

سُنو!
میری قبر مٹّی سے بنانا
اور کتبہ
ایک اینٹ سے بڑا نہ ہو
جانتے ہو
میں ایک سال ہی جی
ایک ہی پل کی سزا ہوئی
ایک ہی حرف کی بددُعا
ایک آنکھ کا گناہ ہوئی
ایک دن، ایک رات ہی کا خواب ہوئی
تُم میری قبر مٹّی کی رکھنا
میری پیاس ایک کنوئیں سے لوٹی
میرا دل ایک ہی درد سے کانپا

میں نے ساری عمر
ایک ہی خواب دیکھا
میری نیند ایک ہی بار ٹوٹی
میں نے ایک ہی حرف لکھا
ایک نظم، ایک کہانی
ایک ہی عورت
ایک اینٹ کا کتبہ!

تاریخ خود کو دھراتی ہے

ہم معذور ہیں
دیکھو
ہمارے ہاتھ اور پاؤں کٹے ہوتے ہیں
اور ہمارے خواب کرنیں لے اُڑتی ہیں
ہماری زندگیاں لوگ گزارتے ہیں
اور ہم ان کی موت بھی خود ہی جھیلتے ہیں
ہماری عادتیں
صبر کے ہاتھوں بگڑی ہیں
ہماری آئندہ نسلوں کی موت بھی
گلا گھُٹنے سے واقع ہوگی !

پرواز

پہلی اُڑان میں پر کُتر ے جائیں تو......

خواہش پرواز نہیں مرتی

بدن کی موت تو وقتی ہے

کیا ایک لمحے کی موت ساری زندگی کو ختم کر سکتی ہے؟

اصل شے تو رُوح ہے

میرے بدن میں کتنی روحیں زندہ ہیں

میں کتنے حافظوں میں محفوظ رہوں گی

کتنی آنکھیں میرے خواب دیکھتی رہیں گی

میں تم ہم سب اِک دُوجے میں زندہ رہیں گے!

کہانی

ایڑھیوں کو دلدل کھا جاتی ہے
اور خوابوں کو خواب نگلنے لگتے ہیں
پھر یوں ہوتا ہے
کہ شہزادی کی ہتھیلی پہ تکلے کی نوک چبھ جاتی ہے
شہزادی چرخہ کس کے لیے کاتتی ہے ؟
اور وہ شہزادہ کہاں چھپا ہے ؟
جو تکلے کی نوک ہتھیلی سے نکالے گا
پھر سوتی ہوئی شہزادی کے ساتھ سارا محل جاگ جائے گا
کیا ہر نوک کے نکلتے ہی منظر تبدیل ہو جاتا ہے ؟
اس دیس کے بدن میں بھی سوئیاں چبھی ہیں
کون نکالے گا ؟
کیا یہ منظر بدل جائے گا ؟

نصیحت

جب زمین میں آنکھیں گڑی ہوں
یا ادھورے خواب سے نیند ٹوٹتی ہو
کسی انجانے جذبے سے بدن کانپتا ہو
تب کسی پروانے پہ دستخط نہیں کرتے
چاہے وہ زندگی کی نوید لے کر آئے
یا موت کا پیغام
ضروری نہیں کہ دستخط کے لیے کاغذ دیا جائے
کبھی کبھی ہاتھ، دل اور آنکھیں تھمائی جاتی ہیں
کچھ بھی تھامنے، سننے، دیکھنے، لکھنے سے گریز کرنا!

ہم تو زندہ ہیں

ملبے میں دبنے والے خاندان کے کئی افراد
شناخت نہ ہونے کے باعث پراسرار ٹھہرتے ہیں
کتنی ملبے میں ملبہ بن جاتے ہیں
یہ روز کی خبر ہے
اہم بھی اور بے وقعت بھی
ہم بے حسی کی چادر اوڑھ کے
دوبارہ گہری نیند سو جاتے ہیں

شائد------

الگنی پہ اپنے کپڑے سُکھانے کو ڈالتی ہوں
مگر سوکھنے کے باوجود
وہ کئی دنوں تک ٹنگے رہتے ہیں
شائد میں اپنی اذیّت اُن کے بدن میں منتقل کر دیتی ہوں
شائد میں اپنے غم سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں
شائد میں کپڑوں میں میل بن کے رہنا چاہتی ہوں
یا شائد میں ایک لباس میں رہتے رہتے تھک گئی ہوں
شائد میں خود کو بھی بھول جانا چاہتی ہوں
شائد........!

فیصلہ

میں انتظار کا لباس نہیں
میں دھوپ پہنتی ہوں
اور برستی بارش میں نہاتی ہوں
وہ میرے کپڑے سوکھنے کا انتظار بھی نہیں کر سکتے
چھوٹے دلوں والے میرے محبوب کیوں ہوتے ؟
میں منتظر کی آنکھ کا ٹھہرا آنسو ہوں
وہ بہنے کی اجازت دیں
تو رخصت ہوں
ڈولی کو کہار ڈھونڈتے ہیں
زندگی کو موت
وہ بچھڑے مل تو جائیں
مگر میں جدائی کی آگ سے بدن تاپ چکی
ماس جلنے کی بو آتی ہے
اب ملاپ ممکن نہیں !

جیل جانے کے لیے ایک نظم

سب چولہے ٹھنڈے پڑے ہیں
مانگ میں جدائی بچھی ہے
چوڑیاں پیس کر کھانے والی عورتیں
بزدلی کا طعنہ لوٹا دیتی ہیں
داغ لباس پر نہیں
روح پہ نشان چھوڑ گئے ہیں
کیا کنواری ماں ہی گناہگار ہے ؟
بیوہ کیوں روتی ہے ؟
کیا سب ماں جائے لوٹ کر نہیں آتے ؟
کفن تو لاش کا زیور ہے
ہم مردہ بدن نہیں

رُوح کی موت پہ
اخبار میں سُرخی نہیں لگتی
تمھیں کسی خوف نے کانپنا سکھا دیا
مجھے کسی زندگی نے مرنا سِکھا دیا
آؤ — نصاب تبدیل کریں
پرُانے نصاب بیچ کر کیا خریدیں گے
آزادی ؟

زر — زن — زمین

تم کسی دروازے پہ ٹھہرے رہنا
دیکھنا! جب تک زنجیر ہلتی رہے گی
تب تک میں زندگی سے موت کا سودا کر چکی ہوں گی
تم زندگی کی طرف لوٹ آنا
مجھے تو موت نے پہلے دن ہی آواز دی تھی
اور تمھیں وہ نہیں پکارتی
اسے تمہارا نام پتہ معلوم نہیں
اُس کے ہر صفحے پر میرا نام لکھا ہے
میرے بدن کے ہر حصّے میں کسی چور کا نام لکھا ہے
تم میرے بدن کی چغلی نہ کھانا
میرا ماس پہلے ہی کئی دانتوں میں دھنسا ہے

میں زمین نہیں
مگر تقسیم کی جاتی رہی
کتنی ٹکڑوں میں تقسیم کی گئی
میرے خریدار بہت
تم بھی قطار میں کھڑے ہو جاؤ
باری آنے پر کاغذ اپنے نام کروالینا
عورت بھی تو کاغذ ہی ہے!

فٹ پاتھ

آسمان میری پیاس چکھ
زمین میری تھکن ناپ
زندگی میرے خواب دیکھ
موت میری آہ سُن
آسمان — زمین
زندگی — موت
سفر کبھی تمام نہیں ہوتا
کوئی حد کبھی ختم نہیں ہوتی
کسی حد کو پہرے آغاز یا انجام کی سفید لکیر سے نہیں پہچانتے
میرا بدن داغ دو
میں خواہشوں کا گناہ کر بیٹھی ہوں
میں مسلسل گناہوں کے فٹ پاتھ پہ چلتی آ رہی ہوں
کوئی انسانی ٹھوکر راستہ کھوٹا کر دیتی ہے
مگر میں گناہ کر کے کھری ہو جاتی ہوں
وہ سب جو گناہ کی پوشاک نہیں پہنتے
لیکن کھرے نہیں ہوتے!

زندہ پتھر

پتھر کی عورت ہوں
مگر وہ پتھر سمجھتے ہیں
مجھ پہ کسی بھی اوزار کا جادو نہیں چلتا
میں نے سرد مہری کو فیاضی سے تقسیم کیا
بس انھیں یہی دکھ ہے
میں نے کوئی عبارت ایجاد نہیں کی
لفظ کھرچنے لگی
تو ناخنوں میں جما
جذبوں کا لہو احتجاج کرتا رہا
میں نے آواز کا جرم معاف کیا
تو انھوں نے اشاروں کی غلیل بنائی
میں شکار ہونے سے پھر بھی بچ گئی
تو وہ میری سمت
دیوانہ وار دوڑے
میں نے جشن میں تالیاں بجائیں

اور ہاتھ چھُپا دیئے
وہ تلاش کا حق رکھتے ہیں
تو کیا میں کھو جانے کا حق نہیں رکھتی
ان کی جیبوں میں سکّے کھنکتے ہیں
زمین دولت پا کے خوش ہے
مگر میں ان کی رُوح میں
درد کی طرح کراہتی ہوں!

آواز پر لکھی نظم

دیکھو

درد کسی کی میراث نہیں

لہو کسی کا لباس نہیں

مگر لہو میں لتھڑی عورت

تنہا اذیت کا سفر کرتی ہے

جیتی ہے — نہ مرتی ہے

موت اس کی آنکھوں میں چھپ کر روتی ہے

زندگی حیرت سے اُس کا بدن تکتی ہے

تخلیق کا کرب

اس کی رگوں میں جاگتا ہے

آدم انگڑائی لیتا ہے

نیند میں چونک جاتی ہے

اور جاگتے میں رو دیتی ہے

ایک نئی زندگی موت کی کوکھ سے نکلتی ہے

کبھی زندہ — کبھی مُردہ —!

کشکول

میں نے ساری دُعائیں
آنسوؤں میں بہا دیں
اور پتھروں کو سجدہ کرتی رہی
ماتھے کے محراب پہ ایمان نہیں میرا
کیوں میرا یقین توڑتے ہو؟
خُدا ہوتا تو......
یہیں کہیں ہوتا
یہ تو انسان ہے
جو کہیں نہیں ہے
یا ہر طرف بکھرا پڑا ہے
کیا پھر زندگی نے کروٹ لی
ٹوٹی چارپائی پہ کیوں سوتی ہو؟

گرنے کا خطرہ لگا رہتا ہے
جان کی پرواہ نہیں تجھے؟
مجھ سے موت مانگتی ہے
تو کیسی بھکارن ہے
دعاؤں سے کشکول بھرے بیٹھی ہے
پھر بھی ہاتھ پھیلاتی ہے؟

لیسبرا

کُنجی

اُن میں سے کوئی میری تلاش میں نکلا
اور میرے در پہ اس کے جذب نے دستک دی
سُنا ہے دیوانگی اچھی نہیں
میں نے اُسے لوٹا بھی دیا
اور اس کا پسندیدہ حصّہ اپنے پاس رکھ بھی لیا
میں نے ہر انسان کو اتنی اجازت کہاں دی
کہ وہ میرے ہاتھ سے کُنجی چھینے
کچھ تالے تو زنگ آلود ہیں
انہیں کبھی نہیں کھُلنا
کئی میں اپنے ہاتھوں سے کھول دیتی ہوں
جب میں چاہوں
اور جب وہ چاہیں
تب میں ساری کُنجیاں گُم کر دیتی ہوں
خود بھی کھوئی رہتی ہوں

جہاں وہ میرے ردِّعمل کا انتظار کرتے ہیں

وہاں میں کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں دیتی

میں نے اداکاری خود سے سیکھی

عیّاری لوگوں سے

انھیں انہی کی باتیں لوٹانا اچھا لگتا ہے

مگر ہر موسم پہ دھول جمی ہے

چیزیں تبدیل ہو جاتی ہیں

اور آج پھر ایک چابی ٹوٹ گئی

ایک عہد نے آخری سسکی لی!

اور خدا کہاں رہتا ہے (انکار کی نظم)

کیسی عجیب بات ہے
تو خُدا ہے
تو خُدا نہ ہوتا
تو میں حوّا جائی نہ ہوتی
کیسی عجیب بات ہے
میں حوّا جائی ہوں
اور آدم
میری کوکھ سے جنم لیتا ہے
میرا لہُو پیتا ہے
مجھے فتح کرتا ہے
اور خود شکست کی کھُردری زمین پر بیٹھا رہتا ہے
میں حوّا جنوں
تو ٹوٹی قبروں کے کتبے اُٹھا اُٹھا کر
میرے بدن پر مارتا ہے
اور تخلیقِ آدم پر زور دیتا ہے

پھر آدم جنم لیتا ہے
تب خُدا کہاں ہوتا ہے؟
اب پیغمبروں کی فہرست مکمل ہو چکی
مریم ہر بار زندہ ہوتی ہے
مر جاتی ہے
مسیحا کہاں سے آتے؟
صرف یسوع ہی مصلوب نہیں ہوا
اس کے بعد سے آج تک
ساری تاریخ صلیب پر ہے
اور خُدا کہاں رہتا ہے
آدم و حوّا تنہائی کا پڑھا ہوا سبق کیوں نہیں بھولتے؟
موت بدن کی کوٹھڑی میں کیوں داخل ہوتی ہے؟
قبرستان کیوں زندہ ہوتے ہیں؟
مِٹّی چھیل چھبیلی نار
ہر وقت اودھم کیوں مچاتی ہے
اور خُدا کہاں رہتا ہے؟

بیک ڈور

BACK DOOR

میں دھرتی نہیں

کوئی آنکھ بادل نہیں

پھر ساون کیسے آئے ؟

موسم تو کب کے روانہ ہوئے

ابھی وہ پہلے پڑاؤ پر ہوں گے

میں قدم قدم چلنے لگی

تو لوگ پتھر ہو گئے

ہاں — کچھ پتھر ٹوٹنے کا معجزہ نہیں دیکھتے

میں بھی ثابت ہی رہی

وہ کونسی زنجیر ہلاتے ہیں ؟

عدل تو وقت کی گود سے اُٹھ گیا ہے

میّاں ! میں تیری طرح سُونی گود کی سزا ہوں

مجھے کسی بد دُعا کے ترازو میں نہ تولنا

میرا آنچل پھٹا ہے

زمانے نے ہنسنے کی کوشش کی

تو پھندا لگا
آنکھیں اُبلنے کے لیے
دیوار کے چولہے پہ چڑھی ہیں
میرے بچے بھی بھوکے ہی سوتے
میرا مرد ہوس کمانے گیا ہے
لوٹتا ہی ہوگا
وہ سیدھے دروازے سے کبھی داخل نہیں ہوتا
کیا آج بھی کھڑکی کھلی رہے گی
یا روزن کا شیشہ ٹوٹے گا
پچھلے دروازے پہ موت کھڑی ہے
اِن مردوں نے شرمندگی کا عذاب نہیں سہا
اور وہ سیدھے دروازے سے کبھی داخل نہیں ہوتا !

بدذات چاندنی اور چور

چاندنی بدذات ہے
بدنامی سے نہیں ڈرتی
تارے غم سے ٹوٹتے رہتے ہیں
آج پورا چاند کہاں سے لائیں
ہمیں تو آدھی زندگی کے ساتھ آدھی موت ملی ہے
پھر خواب من کچھواڑہ بھول جاتے ہیں
جگنو کیا ہر موسم میں چمکتے ہیں ؟
نہیں موسم کیا میرا مرد ہے ؟
جسے دیکھ کر آنکھ روشن ہو
دل موم ہو
تم پھل چراتے پکڑی جاؤ گی
تو کیا میرا نام چور رکھا گیا ؟
میں پھل کہاں چراتی ہوں
میرے ہاتھ تو راکھ میں دبے ہیں

چوری تو ہاتھ بھی کرتے ہیں
دیکھو! میں آنکھیں اُدھار مانگ کر لاتی ہوں
شام کو کچھ نہیں مانگتے
ورنہ وقت کی سزا ہو جاتے ہیں
میں سزا سے نہیں ڈرتی
سزا میری ماں نہیں
پھر غیروں سے خوف کیسا؟

بچھو

سُنو!

کتابیں مہنگی ہو گئی ہیں

ناں لکھی ہوئی کتابیں بے مول ملتی ہیں

اب درد اُدھار نہیں مانگ سکتے

تجربے سستے ہو گئے ہیں

کھُلے بازار میں جدائی بنی پھرتی ہو

ننگے سر اور برہنہ پاؤں کے بیچ کسے تلاش کرتی ہو؟

کیا بہانے کی بالی تمھارے کان میں ڈالی گئی

اور عُذر کی زنجیر گلے میں باندھے پھرتی ہو

تم کیسی عورت ہو؟

بدن سے جُدا ہوئی پھرتی ہو

رُوح سے ملاپ کرتی ہو

وہ سازشی کہیں گے

تو کیا الزام

تمھارے دروازے کا تالا ہے

خاموشی وہ چابی نہیں
جس سے ہر تالا کھول سکو
بغیر دروازے کے گھر میں خود رہتی ہو
اور کمرے کو برہنگی کا طعنہ دیتی ہو
وہ بھی تم پر گیا ہے
کاش کوئی مجھ پر گیا ہوتا
تو کیا مجھ ؓتم پر نہیں گیا؟

آنکھ کا لیٹر بکس

آج پھر میں وقت پھونک پھونک کر چلتی ہوں
فٹ پاتھ چھوٹا ہو گیا ہے
زندگی لمبی ہو گئی ہے
آنکھ کے لیٹر بکس میں خواب کی چھٹی مت ڈالنا
وہ تمھیں جان سے مار دیں گے
تم ہر لمحہ پھونک پھونک کر کب چلو گی ؟
کب سیکھو گی ؟
مجھے اُلجھی کہانی مت سُناؤ
زمانے کی بات کب جانو گی ؟
جب میں بڑی ہو جاؤں گی
کب بڑی ہو گی ؟
جب وہ مر جائیں گے
میں ماں کا پیار بنوں گی

اور ہنسی کی گالی سہوں گی

باپ کی جھڑکی
آدھا حرف بھُول جاتی ہے

میں گنتی گننے لگتی ہوں
میں کبھی بڑی نہیں ہو سکتی

اُنھیں موت کی دُعا نہیں لگتی

الہامی کتابیں
حرف سے داغی جاتی ہیں
خُدا میرا دوست نہیں
تو کیا تیرا دوست ہے؟

نیند

میری کتابیں
پہلے ان پر بوجھ نہیں
اور پھر کمرے میں بکھر گئیں
اُس نے کہا
غلط وقت پہ غلط فیصلہ کیوں کرتی ہو
کوئی بھی وقت یا فیصلہ غلط کیسے ہو سکتا ہے
اور اگر غلط ہے تو کیوں ؟
یہ اُسے بھی معلوم نہیں
میں تو ہوں ہی انجان
اجنبی آواز اور دستک پہ کبھی نہ چونکی
دونوں تھک کر ہاتھ سمیٹ لیتے ہیں
میں بھی جانتی ہوں
کہ وقت کسی کے انتظار میں نہیں جاگتا
میں بیداری کی خواہش میں سو جاتی ہوں
لوگ نیند کی خواہش میں سوتے ہیں

اگر نیند میں بھی آنکھ کھلی رہے تو......؟

کیا تم نیند میں چلتی ہو؟

ہاں نیند میں بھی —

تمھیں خواب بُننا کیسا لگتا ہے؟

میں کیوں خواب بُنوں

مجھے تو خواب بُننے کی عادت ہے

کیا خواب سویٹر ہے

ہاں اتنا ہی گرم جتنی سویٹر

یا محبوب کا الوداعی بوسہ

تم قرض ادا کرتی ہو؟

میں ہر قرض کہاں ادا کر سکتی ہوں

کچھ قرض تو ہم عمریں بیچ کر بھی ادا نہیں کر سکتے

تم خواب بُنتے بُنتے خود اُلجھتی جاتی ہو

ہاں — اور اُس عورت نے کہا

بچّے تو بوجھ کی وہ زنجیر ہیں

جو نہ کٹتی ہے نہ عذاب ختم ہوتے ہیں

اُس نے کہا

میں اُس مرد کے پاؤں کی وہ جوتی ہوں
جسے جب چاہے پہنے — جب چاہے اتار پھینکے
سارا سفر تو جوتی کرتی ہے
پھر مرد کہاں تھکتا ہے ؟
جب وہ عورت کے پہلو میں سکون تلاش کرتا ہے
سکون — نیند — قبر
خود فراموشی میں گہری نیند سونے والے مرد کب جاگیں گے
اُن کی عورتیں پوری عُمر سے جاگتی ہیں
اور اُن کے پیٹ میں مُردہ بچے
آخری گرمی کی خواہش کرتے ہیں
آدھا سُکھ اور پُورا عذاب
بس کیا یہی ہے کتاب ؟
نہیں زندگی کتاب سے بھی طویل ہے
اور تجربے فہرست سے آگے نکل جاتے ہیں !

ہر لکیر مٹ سکتی ہے
مگر کہیں کہیں کوئی نشان رہ جاتا ہے
بھٹکنا انسان کا نصیب کب سے ہوا؟
دیواروں سے جالے ہٹاتے جا سکتے ہیں
مگر انسانی رشتے
کوئی دیوار بھی سلامت نہیں چھوڑتے
اٹھیں تو وقت بھی ہٹا نہیں سکتا

ہر عورت پہیلی ہوتی ہے
پھر ہر مرد دوسرا کیوں کہلاتا ہے
ہر دستور پہ ایک ہی ہاتھ دستخط کرتے ہیں
ہمارے چہرے پہ آنکھیں نہیں
دوسروں کے انگوٹھوں کے نشان ہیں
ہماری زندگی کے خواب دوسرے دیکھتے ہیں
ہم بے کسی کی زندگی جیتے
اور بے بسی کی موت مرتے ہیں!

سوالات

بند سلاخوں میں کتنے قیدی
سِسکتے سِسکتے مر جاتے ہیں
کیا صرف سلاخیں ہی قید خانہ ہیں
انسان کی اپنی ذات نہیں ؟
کیا اونچی دیواریں نہیں سہم کر رو دیتیں
آوازیں جبراً خوف سے کانپتی ہیں
کیا بدن رُوح سے آزادی مانگتا ہے
کیا مانگنے سے آزادی مل جاتی ہے ؟

سوال آنکھیں

جب اُن کے مویشی دوسرے لے جاتے ہیں
اور جب اُن کی فصلیں تباہ کر دی جاتی ہیں
ان کے گھروں کو آگ لگائی جاتی ہے
جوان لڑکیوں اور عورتوں کے بدن داغے جاتے ہیں
تب وہ عورتیں چیخنا بھول جاتی ہیں
اُن کی آنکھیں سوال بنتی ہیں
اور ظالم مرد کو ظالم کہنے سے پہلے زبان کاٹ دی جاتی ہے
جب جنگ ہوتی ہے
جب فتح کا اعلان ہوتا ہے
جب انقلاب کے نعرے بلند کیے جاتے ہیں
اُجڑی مانگ، بنجر کوکھ — لہو کی ندی — عُمر کا روگ
برہنہ بدن — بچوں کا شور
تاریخ کب تک خود کو دہراتی رہے گی ؟

وہ کیسا گورکن ہے ؟

جو مدّت سے پہلے قبریں تیار کرتا ہے

محفوظ کی ہوئی اشیاء سے

جس میں جذبے اور مُردہ انسان شامل ہیں

وہ اپنی بھوک کیش کرتا ہے

وہ کیسا گورکن ہے ؟

حقیقت

میں سیڑھیوں میں ماردی جاؤں گی
یا سڑک کے بیچوں بیچ کچلی جاؤں گی
یا کسی خوفناک بیماری کے ہاتھوں مر جاؤں گی
اس سے کیا فرق پڑتا ہے
موت تو موت ہی ہے
قتل تو قتل ہے
چاہے گمنامی گواہ بنے
چاہے خاموشی
اور چاہے اخبار!

روشنی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی
اندھیرا ہمیشہ جوان رہتا ہے!

سبق

تم بارش میں نکلی ہو
اور شرابور ہونے سے ڈرتی ہو
بزدل ہو
اسی لیے بنا پنکھ کے اُڑنا چاہتی ہو
صحرا میں مسافر یا صدا ہوتی ہے
منزل نہیں ہوتی
ہوائیں تمہارا نوحہ لکھتی ہیں
دوستوں سے بچھڑنے کا وقت آن پہنچا
دشمنوں کو بوسہ روانہ کرو
پیاروں کی پیاس بڑھتی ہے
آنکھ میں آنسو
وقت سے اُدھار لے لو
مگر انہیں چھلکانا نہیں
صرف دکھانا ہے
آج وقت اصل نہیں

نقل کا سبق دیتا ہے
نہ زندگی سچّی ہے نہ موت
سچّی تو صرف میں ہوں یا تم —
آؤ تمہارا ماتھا چُوموں
خود کو فرشتوں کے سپُرد کرنے کی گھڑی آن پہنچی
اور تم سر پہ دوپٹہ جمانے کی فکر میں ہو
موت مہلت نہیں مانگتی
چٹکی بجانے سے پہلے ہی لمحہ گزر جاتا ہے
آدھی رات کو کواڑ نہ کھولنا ——!

بھنور

جب دستک کی آواز نہ سن سکو
تو کوئی بھی دھیمے سُر میں نہیں پکارتا
اور پھر ہر آواز بے سُری ہو جاتی ہے
ہر خواب آنکھ سے ڈھلک جاتا ہے
عورت مردہ بچے جنتی ہے
ہر مرد زانی کہلاتا ہے
حسن کس بازار میں بکتا ہے
جنس کی بولی کہاں کہاں کن لوگوں میں دھرائی جاتی ہے؟
ان تمام باتوں کا جواب نفی میں ہوتا ہے یا اثبات میں
کیا فرق پڑتا ہے
ہر مسئلے کا حل نہیں تلاش کیا جاتا...... اور کیا فائدہ؟
ہم موت کی بھیک مانگتے ہیں
ہاتھوں سے نہیں ـــــ آنکھوں سے
طلب کس سیڑھی سے کرتے ہیں؟
اور ملتا کس پستی میں ہے

ہم کم حیثیت ہو کر جی ہی لیتے ہیں
مگر بے حیثیت ہو کر جیسے مر جاتے ہیں
ہر آواز چیخ بن جاتی ہے
یا خاموشی ——— !
ہر سطح پر سمجھوتہ ممکن ہے بھی اور نہیں بھی ———
ہر مقام پر جواب تبدیل ہو جاتا ہے
الجھن کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے
شائد ہم بھنور میں پیدا ہوتے اور مر جاتے ہیں !

روایت

اجنبی چہروں میں خود کو تلاش نہ کرو
تم بھی بھٹک جاؤ گی
اور پھر کچھ جگہیں بند گلی کی مانند ہوتی ہیں
راستہ نہیں ملتا
اجنبی جگہوں پہ لوگوں کی آنکھیں آگ اُگلتی ہیں
ہر مرد عورت کو ہوس کی نگاہ سے دیکھتا ہے ——
یہ عورت ہی ہے
جو مرد کو کسی بُری نگاہ سے نہیں دیکھتی
آؤ — مردوں میں بیٹھ کر سگریٹ کے کش لینے
یا بُلند آواز میں قہقہے لگانے سے تم بدل نہیں سکتیں
تم تب بھی عورت ہی رہو گی
اتنی ہی بے بس اور مجبُور ——
اگر بہادری کی چھب دکھاؤ گی
تب بھی آدھی رات کو تنہا سڑک پر نہ جا سکو گی
راہ میں کوئی بھی داغ یا باگھ مل سکتا ہے
اور روایت تبدیل نہیں ہوتی
وقت خود کو دہرانے کی عادتِ بد میں مبتلا ہے!

جھنکار

میری آنکھ میں ایک پل رہتا ہے
اور وقت میرے خوف سے کانپتا ہے
میں زنجیر نہیں مگر ٹوٹتی رہی
وہ زہر میری رگ رگ میں اترتا رہا
خواہش راہ کا پتھر ہی تو ہے
اور خواب نیند کا راستہ کھوٹا کر دیتا ہے
سکوں کی جھنکار میں موت رہتی ہے
اور وہ زندگی کو کھوجتے ہیں !

وقت کی سزا

خشک دریاؤں پہ بادل نہیں برستا
جھونپڑی بھیگتی رہتی ہے
(میرے بدن اور روح کی طرح)
وہ بُرقعے والی ہمارا راستہ کھوٹا کرنے والی کون؟
اس سے کہو مُسافرت کے دُکھ نہ بڑھاتے
راستے میں کبھی منزل نہیں آتی
اور کنوارے خوابوں کو سہاگن کی نظر لگ جاتی ہے
میں بد دُعا سے نہیں ڈرتی
وہ برہنہ آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہیں
تو میں وقت کی سزا ہو جاتی ہوں!

تلاش

اُس کا نصیب سیاہ رات میں گہری نیند سوتا رہا

اور اس کا بدن تاریکی میں جاگتا رہا

اس کا بدن بستر کی میلی چادروں

اور ان گنت شکنوں میں بٹتا رہا

وہ انہی جیسی ہو گئی

نہ اس کی ہاں

نہ اس کی ناں

پس ساکت اپنے بدن کو جھنجھوڑتے بدن کو دیکھتی

اور سوچتی

ہاں بس عورت بھی بستر کی میلی چادر جیسی ہی ہے

مگر ___________

برسوں وہ ان ہاتھوں کو تلاش کرتی رہی ہے

جو اُسے بستر کی میلی چادر نہ بنائیں!

نظم

اے عورت تو!

تم اپنی شرمگاہوں کی لاج رکھنا

خود کو سمیٹے رکھنا

تو کیا مرد

اپنے کیے کی لاج نہیں رکھ سکتا

وہ اپنے کیے پہ پشیماں نہیں ہوتا

اور اپنے عمل کے ثبوت سے بھی انکاری ہو جاتا ہے

پھر بھی کہتے ہو

عورت فاحشہ ہے

تو کیا اُسے فاحشہ بنانے والا مرد ہر الزام سے بری ہو جاتا ہے ؟

مرد کی عُمر پہ بھروسہ نہ کرنا

وہ تو عورت کو دیکھتے ہی اپنا اعتماد توڑ دیتا ہے

پھر عورت اس کو قابلِ اعتماد کیسے سمجھتی ہے

کیا تم عورت اور مرد کے رشتے کو نہیں مانتی ؟

کاغذ کے ٹکڑے کو زیادہ اہم جانتی ہو

ہاں — اس لیے کہ یہی کاغذ کا ٹکڑا
میرے بدن پہ کس مرد کی حکومت
اور مرد کا حق جائز قرار دیتا ہے
اور وہ جو بنا کاغذ کے جائز رشتے قائم رکھتے ہیں —؟
وہ بھی سچ اور یہ بھی سچ
جھوٹا تو صرف عورتوں کا جسم ہوتا ہے
جو گواہی کے لیے لفظ تلاش نہیں کر پاتا
اور باکرہ — باکرہ نہیں مانی جاتی!

انسان چیونٹی کی طرح ہی ہے

جوتے تنگ ہو جاتے ہیں

لباس چھوٹا ہو جاتا ہے

ہم جوتے اور لباس تقسیم کر دیتے ہیں

لیکن خواب بانٹے نہیں جا سکتے

ہر آنکھ اپنے خواب رکھتی ہے

بدن کے حصّے کرنے والی عورت بھی جانتی ہے

بدن تقسیم نہیں ہو سکتا

کئی حصّوں پر انجانے میں

ہم لکیر کھینچ دیتے ہیں

اور انسان چیونٹی کی طرح ہی ہے

کئی لکیریں نہیں مٹا سکتا

کئی دیواریں نہیں پھلانگ سکتا

جیسے روح، بدن اور کئی رشتے

جو خمیر میں گندھے ہیں

روح میں گڑھے ہیں

مگر بے نام ہیں!

داغ

وہ میرا بدن سگریٹ سے داغتا تھا یا لفظوں سے
ان باتوں سے کیا حاصل؟
داغ تو داغ ہی ہے
بدن پہ ہو یا روح میں چھپا ہو
وہ میرا ہم بستر کہلاتا تھا
اور ہر رات میری سانسوں کے گھونٹ بھرتا تھا
میرے بدن کی آگ چکھتا تھا
وہ میرے بدن کی ضرورت پوری کرنا جانتا
تو آج دوسری عورت کے پہلو میں نہ ہوتا
مرد عورت کے پہلو میں نہیں
اُس کی رانوں میں سوتا ہے
مگر سچ بولنے سے ڈرتا ہے
وہ کس مُنہ سے کہے
کہ میرے پریٹ میں اس کا نہیں

اُس کے یار کا بچّہ ہے
وہ کسی اور کے سامنے نہیں کہے گا
کہ میں فاحشہ ہوں
لوگ اُسے نامرد جان لیں گے
وہ یہ طعنہ برداشت کر سکتا
تو آج یہاں نہ ہوتا!

صُبح سے ایک کرن کا ہالہ
میرے بدن کو چومتا ہے
میں بے خود ہو کر جھومتی ہوں
سوال کرتی ہوں
کون ہو تم؟
تمہیں میرا پتہ کس نے دیا؟
پھر محسوس ہوتا ہے کہ
ایک خاموش سمجھوتہ دونوں کے بیچ ہو گیا ہے
ہم ایک دوسرے کی لگن میں جنونی کہلاتے ہیں
مسرّت سے زیادہ زندگی کسی لمحے میں نہیں
ہم لمحوں کا گناہ کر بیٹھے
بدن کترنے سے زندگی بڑھ جاتی ہے

ہاں! ہم دیر تک زندہ رہنا چاہتے ہیں
جانتی ہوں
ساری عُمر ایک ہی مرد کو بدن سونپتے رہنے پر بھی
وہ مجھے طوائف ہی کہیں گے
ان کی آنکھ میلی ہے
میرا بدن اُجلا ہے!

تعلق

کوئی جاتے جاتے رک جاتا ہے

جی چاہتا ہے

اپنی باہنہ میں بھر کے

اُس کا سارا چہرہ چُومے

لیکن میلوں دُور سے

بس ایک گرم میٹھی نظر کا بوسہ دیتا ہے

وہ صُبح کا کوئی لمحہ ہو

یا تپتی دوپہر کی بات

یا شام سلونی ہو

یا بستر کی سلوٹ سی رات

وہ کچھ بھی ہو

بستر کے بدن پہ گرنے والی راکھ نہیں

وہ تو اِک سمجھوتہ ہے
کاغذ کے ٹکڑے پہ لکھے جانے والا کوئی جھوٹا رشتہ نہیں
زندگی کے چند آسودہ لمحے
برسوں کی ٹھنڈی برف سے
اُٹھنے والی بھاپ بن کر
اُس کو، مجھ کو زندہ کرتے ہیں!

نظم

میری گود سونی ہے
اور تم جھولی بھرے طنز سے مسکراتی ہو؟
سوتن عورت نہیں ہوتی
لیکھ کی سیاہی ہوتی ہے
جسے کوئی سفیدی نہیں مٹا سکتی
میں کنواری ماں کی بد دُعا ہوں
اور جھوٹے مرد کا گناہ ہوں
آج پھر مجھے وقت کے دانتوں نے کاٹ لیا ہے
میرے باہر لہُو گرتا ہے
تم تجارت بھُول کر گلی سے گزرتی لڑکی کی جوانی گننے لگتے ہو
ہوس تمہارے لہُو میں تمہارے باپوں کے نطفے سے شامل کی گئی
ہر گالی ماں اور ماں جائی کو دیتے ہو

جبکہ مجرم وہ نہیں
تم گناہگار ہو
دن رات کسی نہ کسی بلیٹی کے ساتھ سوتے رہتے ہو
الزام کسی اور کو دیتے ہو
کیا وقت ماں کے رحم سے "بچے" نہیں گرا سکتا؟
یا باپ کے نطفے کا سکہ "ختم" نہیں ہو سکتا —!

نیند کی سِلوٹ

لوگ نیند میں چلتے ہیں
واپس لوٹ آتے ہیں
میں ساری عمر نیند میں رہی
مگر واپسی کا سفر طے نہ کرسکی
لوگ نیند میں سہانے خوابوں کے اَن دیکھے جزیروں پہ ٹھہرتے ہیں
میں ہر پل خود کو روکتی ہوں
مگر ٹھہرنا ـــــ میرا مسلک نہیں
میں خواب نگر دیکھنا چاہتی ہوں
لیکن سمندروں کا پانی
میرے پیروں سے ریت بھی چھین لیتا ہے
میں ریت میں دھنستی چلی جاتی ہوں
سوچتی ہوں
کہیں یہ ریت، دلدل ہی نہ ہو
میری بے خبری سے انھوں نے فائدہ نہ اُٹھایا ہو
لیکن دلدل میں لہریں کب ہوتی ہیں

سُروں کی جھنکار کہاں ہوتی ہے
کہیں ایسا تو نہیں
کہ میں پاتال کی بچھڑی رُوح ہوں
اُس کی صدا پہ اُس سے ملنے جاتی ہوں
اب تو کوئی گنجی — کسی بھی رات کا سناٹا
تاریکی میں پھیلی آواز میں اتنا دم ہی نہیں
کہ رُوح آجاتے

اب تو ہم نے خود ہی اندھیروں میں رہنے
کی عادت ڈال لی ہے
ہم جبراً ہنستے اور مُسکراتے ہیں

لُٹنے کو بس اک عورت ہے

سب کہتے ہیں
شہروں میں انسان بستے ہیں
اور جنگل میں وحشی
اگر یہ سچ ہے
تو وہ جو شہر میں رہتے ہیں
انسانوں جیسے کیوں نہ بنے؟
جذبوں سے عاری
جھوٹے، پھیکے چہروں والے
جن کی آنکھیں لہو میں رنگی ہیں
اور جن کے ہاتھ عورت کا بدن نوچ رہے ہیں
کیا بے عزّت ہونے کو عورت ہی بچ رہتی ہے
تم کمینے مردوں کے پاس
اور تمہاری عزّت........؟
اپنی عزّت بیچ کے
پہلے تم نے کھیلیں بتاشے کھاتے

اور پھر جدید ہتھیار لئے
کیا تم خود محفوظ ہو گئے ؟
سارے شہر — سارے ملک کی عورتیں
خوف کی آگ میں جلتی ہیں
سوچتی ہیں
کیا عورت ہونا ہی جُرم ہے — ؟
مرد جب چاہے — جو چاہے کر ڈالے —
نہ چادر تحفّظ دے
نہ ہی چار دیواری
یہ کیسا قانون ہے ؟
یہ کیسے لوگ ہیں —
سوالوں کے جواب ہیں
وحشت ، ہاتھوں کے زخم
یا کلاشنکوف کی جھنکار !

جنگل کی سازش

اے مُسافر!
جا میں نے تجھے جنگل کو سونپا
میں خود
وقت کی گہری ندی پار کرنے چلی
مگر ڈوبنے سے رہ گئی
میرے بچّے گھر کی آگ نے جلائے
تنکے دریا میں بہہ گئے
میری جھگی ڈھے گئی
پیچھے رہ جانے والے تنکے
اب زمین سے اپنا حق مانگتے ہیں
میں نے دیکھا کہ میرا بدن
راکھ اور مٹّی کے خواب سے جاگا
جب میں اپنی اولاد کی مٹّی میں اُگی
تو موسموں نے سازش کر لی

اُس کے کھیت کی تمام فصلیں تباہ ہوگئیں
مجھے گاؤں کی سرحد سے دُور پھینکا گیا
مگر میں بھاگتی رہی
انھوں نے مجھے ایک گندے نالے میں تلاش کرلیا
مگر میری مسخ شدہ لاش کی شناخت کون کرے گا؟
وہ مجھے دیکھ کر اپنی شناخت بھول گئے!

میں شاعرہ ہوں

میرے ہاتھ یہ درد کہانیاں لکھتے ہیں
میری سانس نظم کی بلائیں لیتی ہے
میرا ماتھا روشن ہی رہتا ہے
مگر میں اندھیرے میں قید کر دی جاتی ہوں
میری رہائی پر
زمین رقص کرتی ہے
آسمان خاموش گیت گاتا ہے
وہ مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہیں
مگر میری خوشی
بچھڑے ہوتے قیدیوں میں رہ گئی ہے
میں اُن کی یادیں
درختوں پہ نوحے لکھتی ہوں
چاند کو ہمراز بناتی ہوں
ہوا اجنبی سی لگتی ہے

تارے ٹوٹنے کا وقت آن پہنچا
تم نے دروازہ بند نہیں کیا
وہ تمھیں کھڑکی سے دیکھتے ہوں گے

ہوشیار!
کہیں آج تم بھی نہ ٹوٹ جاؤ
میں نہیں کہنا چاہتی ہوں
لیکن میرے لب پہ وقت نے ہاتھ رکھ دیا ہے!

افسوس کا سفر

اب سفر کے تمام ذائقے
میرے پاؤں کے تلووں کے لیے اجنبی نہیں رہے
میں نے اپنے پاؤں کے ناخن پہ گزری سیاہ راتوں کی کہانی لکھی
تو ہاتھ کے ناخن نے بیتے دنوں کی نظم کا تقاضہ کیا
میں نے لہو میں ڈوبی قلم نکالی
تو درد کے رشتے جاگ گئے
میں نے سانسوں میں حرف پروئے
تو بانسری روٹھ گئی
میں نے کتابوں سے لفظ ادھار لیے
زمانہ خفا ہو گیا
میں نے ریت پہ اپنا نام لکھا
ہوا منہ پھیر کر اجنبی راستوں کی طرف چل پڑی
میں نے مٹی میں اپنا جسم چھپا لیا
وہ سب خوشی سے چیخ پڑے

اور اُن کی آنکھوں میں میرے نام کا آنسو اُترا
مگر وہ چند
اُداسی میں مٹّی کا چہرہ دیکھ کر
مجھے ڈھونڈتے رہے
جب یقین نے انھیں صبر کی ہدایت کی
تو وہ اندھیرے میں میرے پاؤں کی روشنی پہ گر پڑے!

